وسط ایشیا اور پاکستان

مجوزہ ملاپ کے لئے مسائل آمیز چاہت'

متحارب رجحانات اور حقائق

مصنف: DIETRICH REETZ

مترجم: منور علی خان

دسمبر ۱۹۹۱ء کے سردار آصف احمد علی کے وسط ایشیا کے دورے کو اگر نقطۂ آغاز سمجھا جائے تو چاہت کا یہ عمل جس میں پاکستان وسط ایشیائی جمہوریتوں (CARS)[1] کے ساتھ جو سابق سوویٹ یونین کا حصہ رہی ہیں اتحاد کی بجائے قریبی تعلقات کے حصول کے لئے مصروف ہے اب سے تقریباً تین سال سے جاری ہے۔ آج یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا پاکستان اپنے اس چہیتے مقصد کے حاصل کرنے میں کچھ کامیاب ہے اور ان مسائل کے کیا اسباب ہیں جنہوں نے اب تک چاہت کے اس عمل میں رخنہ ڈالا ہے۔

ان مہینوں میں وسط ایشیا اور اس خطے سے متعلق پاکستان کی پالیسی پر جو مواد جمع کیا گیا ہے اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ مضمون ان مختلف رجحانات اور نظریات کا جائزہ لیتا ہے جو اس عمل کے دوران میں ابھر کر سامنے آئے۔ اس مقصد کے لئے ان وسط ایشیائی ریاستوں کی "بحیثیت مسلمان شناخت" "ان کا روس کے ساتھ تعلق" جس سے وہ منسلک رہ چکی ہیں' ان کی اسلامی شناخت کے متعلق "امریکہ کے خدشات" ' ان کے ساتھ تعاون کے لئے "پاکستان کی توقعات" اور اس تعاون کے خلاف "ہندوستان کا دھمکی آمیز طرز عمل" ' ان تمام پہلوؤں کی نوعیت پر چھان بین ضروری ہے ۔ بحث کا مقصد یہ بتانا ہے کہ تعاون کے حصول کی اس کوشش سے جو امیدیں وابستہ کی گئی ہیں اور اس سے جو خدشات ہیں وہ اتنے اہم نہیں جتنی ان ریاستوں کی شناخت اور ان کی عبوری حیثیت کا جائزہ ضروری ہے۔

فریقین کے رجحانات اور توقعات کے اختلاف کو سمجھنے کے لئے چند بنیادی ہم آہنگیوں کو ذہن میں رکھنا

مفید ہو گا - اب تک مسلم وسط ایشیا ایک بین الاقوامی حقیقت بن چکا ہے جس کی حیثیت بے حد مختلف لوگوں کے لئے مختلف ہے خواہ وہ ہم خیال شرکاء ہوں یا جماعتیں ہوں - سرد جنگ کے اختتام پر یہ مسئلہ اس علاقے میں بے حد مشکل مسائل کو سلجھانے کے لئے ایک مفید اشارہ خود بن گیا یا اسے بنا لیا گیا- یہ بات حیرت انگیز نہیں - ایک بین الاقوامی نظام جو تقریباً چالیس سال تک قائم رہا وہ اچانک ختم ہو گیا- جنوبی اور وسطی ایشیا کے نقطۂ نظر سے اس نظام کا ڈھانچہ وسط ایشیا سے باہر کے دو علاقائی بلاکوں کی مخالفت پر تیار ہوا تھا- جس کا سبب جوہری ہتھیاروں کی ملکیت یا ان تک رسائی تھا- سیاستدانوں کی پوری کی پوری نسلوں نے اپنے اپنے ملکوں میں اپنے کاروبار زندگی کو اقتدار کے ایک ایسے مضبوط مجموعے کے مطابق ترتیب دیا جو ایک دوسرے سے نبرد آزما بین الاقوامی نظام کے کسی نہ کسی جزو سے منسلک تھا- لہٰذا وسط ایشیا آج کل مختلف نوعیت کے بہت سے مقاصد کے حصول میں کام آتا ہے- تنظیم برائے اقتصادی تعاون (E.C.O) کے رکن ممالک کے درمیان باہمی تعاون بڑھانے کے لئے جو ملک اور سیاستدان کوشاں ہیں وہ وسط ایشیا کو جو اب حقیقت بن چکا ہے نہ صرف اپنے باہمی تعلقات، بالا دستی اور مسابقت، علاقائی اقتدار کے ڈھانچے اور روس، چین، ہندوستان اور امریکہ جیسی حساس بڑی طاقتوں کے ساتھ تعلقات جیسے مسائل پر گفت و شنید کے لئے استعمال کرتے ہیں بلکہ وہ اسے اپنے اندرونی مسائل مثلاً سیاسی مسابقت، سیاسی پارٹیوں اور رجحانات کے غلبے اور اقتدار پر کس طرح قابض رہا جائے اور کس طرح اسے حاصل کیا جائے جیسے بنیادی مسائل پر گفت و شنید کا ذریعہ بناتے ہیں- اس لئے اس مقالے کے مختلف پہلو ہیں اور اسی لئے اس جائزے کے دوران میں بعض دفعہ وسط ایشیا جو اس کا مطمع نظر ہے نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے-

سوال پیدا ہوتا ہے کہ وسط ایشیا کے مسئلے نے اتنی شہرت کیوں حاصل کی- واقعات پر ایک سنجیدہ نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ سوویٹ یونین کے ٹوٹ جانے کے بعد کچھ جمہوری ریاستیں ایسی ہیں جن میں معاشی اصلاحات کی اشد ضرورت ہے جن کے پاس قدرتی ذرائع بہت ہیں، جن کے باشندے تعلیم یافتہ ہیں لیکن جن کے پاس کاروباری معیشت اور شراکتی سیاست کا تجربہ بہت کم ہے- اس اعتبار سے ان میں اور بالٹک کی ریاستوں یا مولداویا میں زیادہ فرق نہیں اگر فرق ہے تو قدرتی ذرائع کا اور جو فرق ہے اس کا منفی پہلو زیادہ ہے اور قدرتی ذرائع سے فائدہ اٹھانے کے لئے ان کے بنیادی ڈھانچے میں اتنی سرمایہ کاری درکار ہے کہ فائدے کے امکانات غیر یقینی ہیں بلکہ مشکل ہیں- یہ غالباً ان ریاستوں کی اسلام سے نسبت ہے جس نے

انہیں بین الاقوامی حوالے سے خصوصیت عطا کی ہے۔

یہ سب کچھ خود بخود نہ ہوتا لیکن سرد جنگ کے اختتام پر امریکی اندیشوں کے پیش نظر رونما ہوا۔ ایک سیاسی اور فوجی حریف کے میدان سے ہٹ جانے کے بعد اور اس خلا کو پر کرنے کے لئے وسط ایشیا کا ابھرنا امریکہ کے نزدیک بظاہر بہت خوشی کا باعث تھا۔ اگر کسی کا یہ خیال ہے کہ امریکہ نے اپنے بین الاقوامی شعور میں اشتراکیت کی جگہ اسلام کو دے دی ہے اور اس طرح اسلامی دنیا کو نقصان پہنچانے کے لئے سازش کی ہے تو ایسا نہیں ہے۔ یہ عمل اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے (امریکہ میں فوجی اور حفاظتی ادارے کے کسی شعبے نے جرمنی کو امکانی خطرے کے زمرے میں شامل کیا ہے یا اسے حدود میں رکھنے پر زور دیا ہے لہٰذا اس پہلو کا جائزہ لینے کے لئے بہت سے ذرائع حرکت میں آ گئے ہیں) لیکن یہ تعجب کی بات نہ ہو گی کہ وہ فوجی اور حفاظتی ادارہ جسے دشمن کی نقل و حرکت سے باخبر رہنے کی تربیت دی گئی ہے اس نے جنگ آزما اور تشدد پسند سیاست کو امکانی خطرہ قرار دیا ہے۔ امریکی کارکن اور ادارے ماضی میں تشدد آمیز حملوں کا تجربہ کر چکے ہیں جس کی ذمہ داری اسلامی جنگ پسندوں نے قبول کر لی ہے۔ انتہا پسند اسلامی سیاستدان اب بھی امریکہ کو عفریت تصور کرتے ہیں لیکن رفسنجانی کے دور میں تمام تبدیلیوں کے باوجود ایران اب بھی امریکہ کے ساتھ دوبارہ تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہے۔

وسط ایشیا کی مفروضہ اسلامی شناخت اور امریکی اندیشوں کے شعور کا یہ وہ غیر معمولی امتزاج ہے جس نے بشمول بچے کھچے جوہری مواد جو سوویٹ یونین کے ٹوٹنے کے بعد قاز قستان کے قبضہ میں رہ گیا تھا اور جس پر اب اس کا قابو نہیں چلتا وسط ایشیا کے مسئلے کو شہرت عطا کی ہے۔ یکدم اس مسئلے کو ایک ایسے محرک کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے جس کے اثر سے امریکہ اور بین الاقوامی سطح پر دوسرے امکانی شرکاء جو اس شعوری خطرے کو دور کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے حرکت میں آ گئے۔ ماہرین کے گروہ کے گروہ اس مسئلہ کو حل کرنے میں مصروف ہو گئے اور اب وہ اپنی رائے دیں گے جس کی بصورت دیگر کوئی زیادہ ضرورت محسوس نہ کی جا سکتی تھی۔ روس، امریکہ، جنوبی اور وسطی ایشیا میں ادارے اور مجالس ایک نئے اور ممکنہ طاقتور وقوعے کی وجہ سے جو کسی حد تک ان کا ہی پیدا کردہ ہے اپنے وجود کا جواز پیش کریں گے۔

اسلامی شناخت

جب سوویٹ نظام ختم ہو گیا تو پاکستان نے خیال کیا کہ وسط ایشیا کی مسلمان جمہوریتوں میں "بڑھتی ہوئی

مذہبی آزادی نے اسلامی دنیا کے ساتھ قریب تر تعلقات کی دبی ہوئی خواہشات کو آزاد کر دیا ہے۔"[۲] بظاہر یہی سمجھا گیا کہ وسط ایشیائی جمہوریتوں میں ایک شہری کے لبادے میں ایک سچا مسلمان چھپا ہوا تھا جو ہمہ وقت سامنے آنے کی کوشش کرتا رہا لیکن نامساعد حالات کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا۔ یہ سوچ اس نظریاتی ادراک پر مبنی تھی کہ اشتراکی نظام نے لوگوں کی مرضی کے خلاف ان پر ایک سیاسی شناخت مسلط کر دی تھی۔ لہٰذا سوویٹ شناخت کو نقلی شناخت سمجھا گیا جس نے ان کی اصلی شناخت کو دبا دیا تھا۔ یہ طرز فکر اس صدی کی بیسویں اور تیسویں دہائی میں صریحاً" مذہبی آزادی کے دبا دیئے جانے سے، اس خونی جبر و تشدد اور جلا وطنی سے جس کا راسخ العقیدہ مسلمانوں اور کچھ مسلمان علماء کو نشانہ بنایا گیا تھا اور وسیع پیمانے پر مسلمانوں کے مذہبی اداروں کو تباہ کرنے سے ابھرا لیکن یہ صورت حال ان تبدیلیوں کا پوری طرح جائزہ نہیں لیتی جو بعد میں رونما ہوئیں۔ نسلیں پروان چڑھیں اور انہیں ایسے حالات اور قدروں کے مطابق اشتراکیت کے سانچے میں ڈھالا گیا جو ان قدروں سے بالکل مختلف تھیں جنہیں روایتی طور پر مسلم اقدار کہا جاتا ہے۔

پاکستان اپنے اس نظریے میں تنہا نہیں تھا کہ وسط ایشیا کے مسلمانوں کی صحیح شناخت کے لئے اگر صرف سوویٹ شناخت کی تہ کو ہٹا دیا جائے تو بڑی آسانی اور آرام کے ساتھ ان کی اصلی اور صحیح شناخت تک پہنچا جا سکتا ہے اور یہ شناخت سیاسی اور ثقافتی اعتبار سے نزدیک ہو گی۔ اس قسم کا غلط اندازہ دنیا کے دوسرے حصوں کے متعلق بھی لگایا گیا تھا اور اس کے بھی ایسے ہی نتائج نکلے۔ بالٹک کی ریاستوں کے متعلق اندازہ لگایا گیا کہ وہ سوویٹ روس کے بقیہ حصوں کے مقابلے میں یورپ سے زیادہ مماثلت رکھتی ہیں اور اسی لئے حریت پسندی اور مہذب سوسائٹی کی برکات آسانی سے قبول کرتے ہوئے اپنے اداروں کو جمہوری رنگ میں رنگ دیں گی اور سب سے پہلے منڈیوں کی اصلاح کی طرف توجہ دیں گی۔ اصلاح کے اس عمل میں جلد اور نمایاں کامیابی کی پیشین گوئی کی گئی تھی لیکن تین سال گذرنے کے باوجود حقیقتاً کوئی فرق نہیں پڑا۔ جرمنی کا اتحاد بھی بڑی حد تک اسی مفروضے پر عمل میں آیا تھا اور مشرقی جرمنی کے باشندوں کے دراصل جرمن نژاد ہونے کی وجہ سے اسے جائز قرار دیا گیا تھا۔ سیاسی پارٹی کے آمرانہ تقاضوں کے قطع نظر اصلی جرمن نژاد یقیناً جرمنی کے ساتھ اتحاد کے لئے تیار ہو گا جس کے لئے وہ روز ازل سے متمنی رہا تھا۔ مولداویا اور یوکرین کی رومانی آبادی کی شناخت کے متعلق مذاکروں میں بھی اسی قسم کی اور زیادہ مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔

حصول آزادی کے مرحلہ میں تین سال گزر جانے پر عام خیال یہ ہے کہ وسط ایشیا اور سابق سوویٹ

یونین کے "کٹر" کمیونسٹوں کے اس رویہ کی مذمت کی جائے کہ وہ اپنے طرز عمل میں کسی اصلاح یا تبدیلی کے لئے رضا مند نہیں ہیں لہٰذا یہ شک پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی یہ قابل برداشت ہے کہ ان کے لئے اتنی کوشش، حمایت اور مالی امداد کی جائے جس کے دراصل وہ مستحق نہیں ہیں۔

ان حالات میں یہ کہا جاتا ہے کہ غلط فہمی کی اصل وجہ کا پتہ لگا لیا گیا ہے۔ سیاسی چلن سیاسی اقتدار کی اوپر والی تہہ تک ہی محدود نہیں ہوتا۔ وہ روزانہ کے طرز عمل کے پورے دائرے میں پایا جاتا ہے کہ روزانہ کے معاملات کو کس طرح طے کیا جانا چاہئے۔ اس میں مضبوط مقامی اور سماجی عناصر شامل ہوتے ہیں کہ سماجی اور ثقافتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کہاں جانا چاہئے۔ اگر یہ ثقافتی مراکز ہیں، جماعتی مراکز ہیں یا مساجد ہیں تو ان میں خواتین کا کیا کردار ہے۔ بچوں کی پرورش کس طرح کی جانی چاہئے وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا سیاسی چلن مرکزی سطح پر تبدیلی سے ختم نہیں ہو جاتا بلکہ یہ اداروں کی تعمیر اور اقدار کی دوبارہ سمت بندی کے طویل اور تکلیف دہ عمل کے ذریعہ جو کم از کم ایک نسل پر محیط ہوتا ہے بالعموم صرف اپنا روپ بدل لیتا ہے۔ اسی دوران میں ان ممالک کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، ان کے سیکھنے کی صلاحیت پر اعتماد کرنا پڑتا ہے، ان کے فیصلوں کو تسلیم کرنا پڑتا ہے اور ایک طرز زندگی سے دوسرے طرز زندگی کی طرف جانے کے لئے ان کے طریقہ کار کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔

بیرونی دنیا اور وسط ایشیا کے ساتھ پاکستان کے طرز عمل کی معقولیت اور حالات کے دباؤ کو اگر ان معنوں میں خصوصی اور منفرد تسلیم کر لیا جائے کہ وہ خاص طور سے اندرونی تقاضوں اور ہندوستان کے ساتھ مقابلے کی پیداوار ہیں (جس کی تفصیلات بعد میں دی جائیں گی) تو وسط ایشیا کی جمہوریتوں CARS کو بھی ان کے حالات کی معقولیت اور دباؤ کی وجہ سے رعایت دینی ہو گی ہر چند کہ اس میں دوسرے علاقے شریک نہیں ہیں اور نہ ان کے حالات معقولیت پر مبنی ہیں۔

پاکستان کے وہ سیاستدان جو ابتدا ہی سے وسط ایشیا کے حالات کا جائزہ لے رہے ہیں اور سردار آصف احمد علی کی طرح انہیں وسط ایشیا کے ساتھ براہ راست رابطے کے مواقع حاصل رہے ہیں اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ وسط ایشیا کے رہنما سابق سماجی اور سیاسی نظام کے مضبوطی کے ساتھ حامی ہیں۔ ان میں تبدیلی کی بجائے گذشتہ نظام سے پیوستگی کے عناصر زیادہ پائے جاتے ہیں اور دوسرے شعبوں کے مقابلہ میں ماضی کے ساتھ ان کا قطع تعلق پوری طرح واضح نہیں ہے۔ اس صورت حال کی ایک وجہ یہ ہے کہ سوویٹ

نظام میں سیاسی چلن ہر جگہ یکساں نہیں ہے- وسط ایشیائی جمہوریتوں نے پدری تسلط والی مشرقی سوسائٹی کے عناصر کو قائم رکھا ہے جس میں اشتراکیت کے آمرانہ نظام کو شامل کر دیا گیا ہے- اس لئے یہ توارد نہیں ہے کہ وہ حریت پسندی اور مشاورتی سیاست سے خوش نہیں ہیں بلکہ یہ اس نظام کا جس سے وہ منسلک رہے ہیں تقاضا ہے- ان کے صدر تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ اپنی قوم کی اسی طرح نگرانی کرتے ہیں جس طرح ایک خاندان میں باپ کرتا ہے- ان کے اس رجحان کی بہت حمایت کی جاتی ہے- ان کا استدلال یہ ہے کہ جس چیز کی انہیں ضرورت ہے اور جو عوام چاہتے ہیں وہ روایتی انتخابات یعنی انتخابات برائے انتخابات نہیں ہیں بلکہ انہیں اپنے مسائل کا حل چاہئے- مسائل بالکل وہی ہیں جو سابق سوویٹ نظام میں تھے- ان کی سوچ یہ ہے کہ مکان، شہر کے اندر سواری کی آسانی، روزانہ کے استعمال کی چیزیں، تعلیم، پانی اور روزگار یہ سہولتیں ہر ایک کو ملنی چاہئیں- وہ ان مسائل کا حل خاص طور سے انتظامیہ اور افسر شاہی کے ہاتھوں چاہتے ہیں- حسب سابق وہ ہنگامی طور پر تو فصلوں کی حالت، اشیائے ضرورت کی فراہمی اور قیمتوں کی کیفیت جیسے مسائل کے بارے میں ضلعی افسر سے بات کر لیتے ہیں- سابق سوویٹ نظام کے دستورالعمل PERESTROIKA (معاشی، سیاسی اور سماجی نظام کی تشکیل نو) کے تحت یہ سوچ پائی جاتی ہے کہ نظام کو بدلنے کی بجائے اسے بہتر بنانے کے لئے کوشش کرنی چاہئے - منڈیوں کی اصلاحات اور نج کاری سے متعلق ان کے بیانات پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کے بیانات اس لئے دیتے ہیں کہ اپنے بجٹ کے خساروں کو پورا کرنے کے واسطے مغربی ممالک سے قرضے لینے کے لئے اس قسم کے بیانات شرط ہیں لیکن وہ اس مطالبے کی منطق سمجھنے سے قاصر ہیں جو انہیں منڈیوں تک لیجانے کے لئے ان سے کیا جاتا ہے- انفرادی اقدام پر انحصار کرنے کا طریقہ ابھی تک حاصل نہیں ہوا ہے- ایسے ادارے جو ایک مستعد سماجی اور جمہوری سرمایہ داری کو رواج دیں معلوم نہیں ہیں - نج کاری کو غیر مفید کارخانوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا گیا ہے اور یہ بھی ضروری سمجھا گیا ہے کہ معیشت کو اعلیٰ سطح پر اکابرین کے قابو میں دے دیا جائے- قانون سازی اور ایک قابل اعتماد قانونی نظام کی اہمیت کا احساس اب انہیں ہو چلا ہے اسی طرح اصلاحات کے چار پانچ سال بعد نیم دلانہ اور نامکمل اصلاحات کی مخالفت پیدا ہونی شروع ہو گئی ہے- ان کی خامیوں کو دور کرنے اور انہیں زیادہ انقلابی بنانے کی بجائے انہیں بالکل ختم کر دینے کے لئے بلکہ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ نج کاری یا اصلاحات نے ایک عام آدمی کی حالت کو بہتر نہیں بنایا ہے اس لئے ان اصلاحات کو ترک کر دینا چاہئے (یہ عام رجحان

ہے جس کو ظاہر کرنے کے لئے حالات کی یہ ایک سادہ سی مرقع کشی کی گئی ہے)۔

وسط ایشیائی جمہوریتوں CARS کی انتظامیہ کی بڑی سوچ یہ ہے کہ اپنے اقتدار کو مستحکم کیا جائے' ایسے سیاسی جھگڑوں اور چیلنجوں سے بچا جائے جو متضاد رجحانات پیدا کریں اور معاشرہ میں اختلافات کا باعث بنیں کیونکہ انہیں منڈیوں تک پہنچنے کے عبوری دور کے لئے اتحاد کی ضرورت ہے۔ انہیں اس بات کا احساس ہے کہ انہیں بین الاقوامی امداد دینے والوں کے دباؤ کو برداشت کرنا ہے اور اسی لئے وہ مالی امداد کے حصول کے لئے ہر نظریئے کو قبول کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں لہٰذا اپنی بقا کے لئے ان کی حکمت عملی یہ ہے کہ وہ روسیوں کے لئے آزاد مملکتوں کی کونسل CIS کے نہایت قابل اعتماد رکن ثابت ہوں' پاکستان اور ایران کے لئے وہ ان کے مسلمان بھائی ہوں' ترکی کے لئے وہ ترک ہوں اور یوروپین برادری کے لئے سابق یونین آف سوویٹ سوشلسٹ ریپبلک USSR کے رکن کی حیثیت سے یورپ کی باہمی تحفظ اور تعاون کی کانفرنس CSCE کے عقبی دروازہ سے داخل ہو کر خود کو پوری طرح یوروپین ثابت کریں۔

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں وہ اپنے اس کہنے میں مخلص نہیں ہیں اور نہ کبھی تھے؟ ایسا خیال کرنا مناسب نہیں ہے لیکن ایسی صورت حال میں جہاں معاشرہ میں مذہبی معمولات اور اللہ پر یقین کے نظریہ کو کم سے کم اہمیت حاصل ہو تو اسلام محض ایک ثقافتی جنس بن کر رہ جاتا ہے۔ اسلام ان کے لئے ایک مرکزی نقطہ ہے جو انہیں ان کی شناخت کی تلاش اور کسی کے ساتھ اپنا تعلق قائم کرنے میں مدد دیتا ہے - اس سلسلہ میں قاز قستان کے نوجوان طالبعلموں سے اسلام کی طرف ان کا طرز عمل معلوم کرنے کے لئے جو سماجی جائزہ مارچ ۱۹۹۳ میں لیا گیا تھا خصوصیت رکھتا ہے - جواب دینے والوں میں سے ۴۲ فیصد اسلامی رسومات و عبادات پر یقین نہیں رکھتے' ۳۸ فیصد صرف رسومات اور تہواروں کو مانتے ہیں اور صرف ۳۰ فیصد اسلامی عبادات پر عمل کرتے ہیں۔ اکثریت کے لئے جو ۶۵ فیصد پر مشتمل ہے اسلام قاز قستان کی قومی ثقافت کا جزو لاینفک ہے کیونکہ اسلام ہی کے ذریعہ قاز قستان کی تاریخ' سابق نسلوں کی مذہبی عادات اور رسومات مرتب ہو کر سامنے آئیں ہیں تاہم جہاں تک ثقافت کا تعلق ہے ۳۳ فیصد جواب دینے والے سمجھتے ہیں کہ اسلام ہی ان کی قومی ثقافت کے اظہار کا واحد ذریعہ نہیں ہے - ان کے نزدیک قاز قستان کا ماقبل اسلام دور اور دوسرے عناصر ثقافت کے اظہار کے لئے اتنے ہی اہم ہیں - جہاں تک اسلام اور منڈی کی اصلاحات کا تعلق ہے جواب دینے والے ۹۰ فیصد لوگوں کا خیال ہے کہ معاشرہ کی مروجہ

آزاد خیالی، منڈی کی معیشت اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں ہے - ان کا نظریہ ہے کہ مذہب کا انتخاب معیشت کو متاثر نہیں کر سکتا۔ طلبا کی ایک تھوڑی تعداد یعنی ۱۴ فیصد اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ اسلام اور معاشی اصلاحات میں کوئی مطابقت نہیں ہو سکتی لیکن اس کے لئے وہ بالکل مختلف وجوہات بتاتے ہیں۔ مارکسی دلائل سے متاثر ہونے کی وجہ سے بعض کا خیال ہے کہ اسلام سماجی ترقی کے راستہ میں رکاوٹ ہے جبکہ راسخ العقیدہ گروہ کے دلائل استعمال کرتے ہوئے دوسروں کا نظریہ یہ ہے کہ مروجہ خرید وفروخت کے معاملات اسلامی اخلاقیات کی اقدار کے منافی ہیں۔[۳] قاز قستان کی نسلی ابادی کی خصوصیت کا جہاں تک تعلق ہے جہاں روسی آبادی کا بڑا حصہ ہیں جمہوریہ کے روسی طلبا کے علاوہ وہ تعداد جو قاز قستان کی آبادی کے جائزے سے معلوم ہوئی ہے اس کے اسلامی شعور میں قابل قدر اضافہ ہوتا جا رہا ہے تاہم یہ شعور بنیادی طور سے صرف ثقافتی قدروں تک محدود ہے - وسط ایشیا کی بقیہ جمہوریتوں کے موازنہ کے لئے اعداد وشمار آسانی سے دستیاب نہیں ہیں۔ براہ راست رابطہ کرنے کا تجربہ کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی زیادہ مختلف نہیں ہونگے۔

لہٰذا یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وسط ایشیا کے لوگ اس حد تک اسلام کے احکام پر عمل کرنے کے لئے تیار ہیں (تھوڑے سے عدم احترام کے انداز میں) جس حد تک وہ انہیں وڈیو کی دوکانوں میں دلچسپی لینے کی آزادی، مقبول عام موسیقی pop music سے لطف اندوز ہونے اور ایسی تحریکوں میں شرکت سے نہیں روکتا جو صارفین کے مفادات سے متعلق ہیں (cansumerism)۔ ان کا رجحان دراصل پوری طرح افادیت پسندانہ ہے۔ اسلام کا وہ خیر مقدم کرتے ہیں اگر وہ ان کے مقاصد کو پورا کرتا ہے یعنی وہ ان کی زندگیوں کو بہتر، زیادہ آسان، زیادہ آرام دہ اور ممکنہ طور پر جدید بنا دیتا ہے۔

نظری اعتبار سے ان کی شناخت بڑی حد تک حالات کے مطابق اور عبوری ہے۔ جب بھی نوزائیدہ باہمی تعلقات میں کوئی مستحکم صورت حال پیدا ہوگی تو وہ اپنی وفاداریوں کو قطعی شکل دے سکیں گے۔ شناخت ایسی وفاداریوں سے متعلق جہاں مسابقت کا عنصر شامل ہو ایک پیچیدہ معاملہ ہوا کرتی ہے۔ مسابقت حاصل کرنے کا یہ عمل ابھی تک جاری ہے۔

روسی شرائط

پاکستان اور دوسرے ای۔ سی۔ او ECO کے رکن ممالک مثلاً ایران اس دباؤ کی بات کرتے ہیں جس کا

روس کے ساتھ تعلقات میں وسط ایشیا کی جمہوریتوں کو مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ علاقائی تعاون میں نمایاں ترقی حاصل کرنے کے لئے جس کی طرف وسط ایشیا کی ریاستوں کو بھی ترغیب دی گئی ہے۔ تعاون کے اس نظریہ کا تفصیل سے جائزہ لینا ہو گا۔[۴] ابتدا ہی میں حالات کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے یہ ماننا پڑے گا کہ روس نے اسٹالن کے دور سے ہی روسیانے کی پالیسی کے ذریعہ مادی دولت خاص طور سے خام مال کو روس منتقل کر کے اور چھوٹی قوموں کی سماجی اور اقتصادی ترقی کی بجائے ان کے انسانی اور اقتصادی ذرائع کو بڑی طاقتوں کی سیاست کے لئے بلا روک ٹوک استعمال کر کے یقیناً فائدہ اٹھایا لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ لینن اور اسٹالن کے قومی حق خود ارادیت کے نظریہ کا بھی الٹا اثر ہوا۔ اس کے ذریعہ سوویٹ یونین کی اختتام کے قریب روس قرض اور امداد دینے والا بڑا ملک بن گیا جب کہ روسی معیار زندگی تیزی سے زوال پذیر ہونے لگا اور سرحدی ریاستوں کے معیار زندگی سے بھی نیچے گر گیا۔ اسی وجہ سے وہ قومیں معرض وجود میں آ گئیں جن کا پہلے وجود نہ تھا جس کی نمایاں مثال ترکستان کے علاقہ میں وسط ایشیائی جمہوریتوں کا ظہور ہے۔ آج کی ازبک، قازق اور تاجیک قوموں کی نسلی شناخت ایک ہی مورث اعلیٰ سے ظہور پذیر ہوئی ہے اور یہ نسلی تقسیم بعد میں عمل میں آئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ روس کو اس حیثیت سے یاد کیا جائے گا کہ اس نے ان ریاستوں کو قومی شکل دینے میں ان کی سرپرستی کی۔ ماسکو کے ساتھ ان ریاستوں کا رویہ اور روس کے ساتھ ان کی محبت غیر واضح تھی اور ہے۔ جب سوویٹ یونین واضح طور پر زوال پذیر ہونے لگی اور روس ان کی توقعات کو پورا نہ کر سکتا تھا تو وسط ایشیائی ریاستیں دوسری سرحدی ریاستوں کے ساتھ مل کر روس کی چودھراہٹ اور سامراجی حکومت کے خلاف آزردگی کا اظہار کر کے علیحدہ ہو گئیں۔ جب ان ریاستوں کی اقتصادی حالت گرتی جا رہی تھی اور ماسکو نے سماجی بدامنی اور باہمی کشمکش کے ذریعہ معمولی سی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی تو طوفان نے رخ بدل لیا۔ جب تک وسط ایشیائی ریاستوں کے چور بازار میں ڈالر کو فروخت کرنے کے لئے متبادل کرنسی کی بجائے روسی روبل کو ترجیح دی جاتی رہے گی یہاں کے عوام اور سیاستداں دونوں کو ماسکو سے رہبری حاصل کرنا ہو گی کہ منڈی کی اصلاحات کے ذریعہ کس طرح ویسے ہی نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں جیسے روس کو حاصل ہوئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہیں روسی تسلط کے دوبارہ قائم ہو جانے کا اندیشہ ہے لیکن صرف کسی حد تک۔ اگر مقامی انتظامی امور ان کے ہاتھوں میں رہیں تو وہ ماسکو کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار ہیں۔ وہ روبل کے نئے حلقہ اثر میں داخل ہونا چاہتے ہیں لیکن وہ روس کی افراط زر اور بجٹ کے

اخراجات پر گرفت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں- یقیناً ماسکو معصوم نہیں ہے اور نہ ہی وہ نجات دہندہ ہے- اس کی اصلاحات خطرناک حد تک غیر مستحکم ہیں لیکن وہ بشمول وسط ایشیائی ریاستوں کے بہت سی سرحدی ریاستوں سے میلوں آگے ہے جہاں کرغستان اور قازقستان کے علاوہ معیشت پر قابو پانے کے لئے ابھی حقیقی تبدیلی ہونا باقی ہے-[۵]

روسی سیاست مختلف مدارج سے گزری ہے جب کہ روسی جمہوریت پسندوں کا پہلا جذبہ یہ تھا کہ انہیں جس قدر ممکن ہو تیزی سے آگے بڑھنے دیا جائے لیکن کٹر قوم پرستوں نے یلسن انتظامیہ پر زور ڈالا ہے کہ وہ ایسے مواقع کی تلاش میں رہیں جب کہ روسی جھنڈے کو لہرا کر روسی بالا دستی کا اظہار کیا جائے- روسی سیاستدانوں نے بھی روس کا مفاد اسی میں دیکھا کہ وہ انتخابات میں بہتر نتائج حاصل کر کے روس کے وقار میں اضافہ کریں- روسی جمہوریت پسندوں نے جو روسی انتظامیہ کو دانشورانہ حمایت فراہم کرتے ہیں اپنے رویہ میں تبدیلی کی ہے اور وہ سرحدی ریاستوں کے معاملات میں روس کی فعال سرگرمیوں کو حق بجانب سمجھتے ہیں- اس سلسلہ میں ایک سیاسی مفکر اور صدارتی کونسل کے ممبر اینڈرانک مگرانیاں Andranik Migranyan کا مضمون Literaturnaya Gazeta میں شائع ہوا جو روسی دانشوروں کا حامی ہے قابل توجہ ہے جس میں اس نے سرحدی ریاستوں کے معاملات میں روس کے تازہ ترین جنون کی نظری وضاحت کی ہے-[۶] اس کا خیال ہے کہ سرحدی ریاستوں میں عدم استحکام اس حد تک پہونچ چکا ہے کہ وہ روس کے اندر معاشی اصلاحات کی کامیابی میں رکاوٹ بن رہا ہے- بریزینسکی Brzezinski اور کسنجر Kissinger کا حوالہ دیتے ہوئے وہ روس کے خلاف ایک قسم کی "جغرافیائی اور سیاسی تکثیریت" (جغرافیائی اور سیاسی مفادات کی گروہی شکل) کی سختی سے مخالفت کرتا ہے جس کا جیسا کہ کہا جا رہا ہے یہ مقصد ہے کہ ایسی طاقتوں کو یا طاقتوں کے اشتراک کو جنم دیا جائے جو روس کا مقابلہ کر سکیں اور روس کو ایک قسم کے شفا بخش حلقہ Cordon Sanitaire میں محدود کر سکیں- اس سلسلہ میں وہ "یوکرین یا قازقستان یا کچھ اور ریاستوں کے مجموعہ" کا ذکر کرتا ہے اور ہوشیاری سے اس مجموعہ کو اسلام یا مسلم کا نام نہیں دیتا- لہٰذا پاکستان اور وسط ایشیا کے دوسرے ممکنہ شرکاء کو چاہئے کہ وہ اس صورت حال کا جائزہ لیں اور اگر وہ تعاون کو عملی شکل دینے چاہتے ہیں تو اس تحریک کو سمجھیں- یہ عمل اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ روس کو نظر انداز کر کے وسط ایشیا کے ساتھ تعاون آگے نہیں بڑھ سکتا اور نہ ہی کسی خصوصی حق پر مبنی روس کے ساتھ مقابلہ کے

ذریعے۔

اس کے برخلاف سابق سوویٹ جمہوریتوں کو ایک وحدت میں دوبارہ مدغم کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ دلائل دیئے جا رہے ہیں۔ حال ہی میں ایک دلیل بہت مقبول ہوئی کہ سابق سوویٹ یونین سے باہر کے مغربی نمونے ان جمہوریتوں کے مسائل حل کرنے میں زیادہ مدد گار ثابت نہ ہوئے۔ ان میں سے کوئی بھی کوشش کیوں کہ خصوصی طور سے کامیاب نہ ہو سکی لہٰذا یہ جمہوریتیں اپنی ہی قسم کی تبدیلی اور تسلسل کی بحالی کی حامی ہیں اور رہبری کے لئے روس ہی کی طرف مڑ کر دیکھتی ہیں۔[۷] سابق سوویٹ یونین کی ثقافتی اور معلوماتی فضا کو واپس لانے کے لئے آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں یوریشین (یورپ اور ایشیا کو ملانے کا نظریہ) نظریہ توجہ طلب ہے جس کے ذریعہ ایک مشترکہ سیاسی علاقہ معرض وجود میں آ جائے گا جو یورپ اور ایشیا کے ان حصوں پر مشتمل ہو گا جو سابق سوویٹ یونین میں شامل تھے۔ یوریشین کی اصطلاح ہمیشہ ایک ہی معنوں میں استعمال نہیں ہوئی ہے۔ قازقستان کے صدر نے یوریشین یونین کی تجویز پیش کی ہے جو معنوی اور علاقائی اعتبار سے سابق سوویٹ یونین کے کافی قریب ہو گی لیکن اس کے مقابلہ میں کم مرکزیت پسند ہو گی اور ریاستوں کے باہمی تعلقات پر مبنی ہو گی۔ یہ نظریات یوروپین برادری اور نیٹو NATO کی کامیاب ہم آہنگی کے نمونوں سے بے حد متاثر ہیں۔[۸] ایک مصنف نے یوریشین نظریہ کو ECO کے اراکین اور کاکیشین ریاستوں تک محدود کر دیا ہے اور اسے جنوبی یوریشیا کا نام دے دیا ہے۔[۹]

ایک اور اصطلاح جو اس سلسلہ میں استعمال ہو رہی ہے تہذیب و تمدن ہے۔ سابق سوویٹ یونین کی ریاستوں کو تہذیب و تمدن کے اعتبار سے کیتھولک، کٹر روسی اور اسلامی خطہ میں تقسیم کرنے کے نظریہ کی مخالفت بڑھ رہی ہے۔ یہ تجویز اس رجحان کی آواز بازگشت ہے جسے امریکن اسکالر ہنٹنگٹن Huntington[۱۰] نے ڈیوس Devos کے اجلاس میں پیش کیا تھا اور جس میں پاکستانی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو بھی شریک ہوئیں تھیں اور انہوں نے اس کے دلائل کو مسترد کر دیا تھا۔[۱۱] لہٰذا یہ سوچا جائے کہ اس پہلو پر پاکستان اور روس کے درمیان کسی ذہنی سمجھوتہ کی گنجائش ہونی چاہئے۔[۱۲]

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ سوویٹ یونین کو پھر سے زندہ کیا جا رہا ہے جیسا کہ وہ گذشتہ ستر سال کے دوران میں موجود تھی لیکن ۱۸۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۴ء کے آزاد ریاستوں کی تنظیم کے تازہ ترین سربراہی اجلاس کے بعد بھی یہ بالکل ناممکن ہے جس میں پہلی بین الریاستی تنظیم یعنی ایک اقتصادی کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔

جمہوریتوں کا یہ اتحاد ماضی سے بہت مختلف ہو گا۔ اگر کوئی بنیادی تبدیلی عمل میں آئی ہے تو وہ یہ ہے کہ لوگ خواہش رکھتے ہیں کہ جو بھی تبدیلی یا ترقی ہوئی ہے وہ اس کے فوائد میں حصہ دار ہوں۔ اب کسی آمریت پسند ڈھانچہ کا دوبارہ ظہور پذیر ہونا بہت مشکل ہے جو بغیر منڈیوں کی اصلاح کے معاشی ترقی اور خوشحالی کو حاصل کر سکے۔ نئی ریاستوں کے اکابرین جنہیں اپنی قومی انتظامیہ میں روزگار ملا وہ بڑھتی ہوئی بے روزگاری سے تاریک تناظر میں کھیل کے اس میدان کی حفاظت کرنا چاہیں گے۔

امریکہ کے اندیشے

وسط ایشیا کے مسئلہ میں امریکہ کا طرز عمل بھی انتہائی مبہم ہے۔ بریزیزنسکی Brzezinski اور کسنجر Kissinger اس سلسلہ میں خواہ کچھ بھی کہتے ہوں امریکہ سب سے بڑھ کر اولیت اس بات کو دیتا ہے کہ سابق سوویٹ یونین کے علاقہ سے ظاہر ہونے والے ہر خطرہ کے امکانات کو کم سے کم کیا جائے نہ کہ روس کو اس کے حدود میں محدود رکھا جائے۔ امریکہ یقیناً مضبوط سماجی ضمانتوں کے ساتھ آزادی اور آزاد خیال مشارکتی منڈی کی معیشت کی طرف اقدام کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتا ہے۔ اگر وسط ایشیائی جمہوریتیں اس عمل میں خود کامیاب ہو جاتی ہیں تو امریکہ یقیناً اس کو ترجیح دے گا کیوں کہ اس طرح وہ روس کو روک سکے گا لیکن امریکہ سرحدی ریاستوں میں معاشرتی اور اقتصادی بے چینی اور عدم استحکام کو روکنے کے لئے تن تنہا اقدامات سے بہت تھک چکا ہے لہٰذا وہ ترجیح دے گا کہ دوسرے ممالک بشمول روس اس بوجھ کا زیادہ حصہ اٹھائیں۔ امریکہ جیسا کہ ظاہر ہے اور جیسا کہ امریکہ کے لوگ سمجھتے ہیں وسط ایشیا میں اسلامی "بنیاد پرستی" کے مقابلہ میں روس کے اثر کو اب بھی زیادہ پسند کرے گا اور جوہری توانائی کے تمام ذرائع پر روس کے غلبہ کو ترجیح دے گا۔ اس سے روس کے ارادوں کے متعلق تمام تذبذب اور شبہات کے باوجود سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد کی دنیا میں علاقائی طاقتوں کے دائرہ اثر کے علاقوں کی نگہداشت سے متعلق امریکہ کے رجحان کا پتہ چلتا ہے۔

پاکستان کی توقعات

وسط ایشیا کے مسئلہ کی شکل میں پاکستان کے لئے بہترین موقع ہے کہ علاقائی طاقتوں کے اتحاد کے عمل

میں جس کا مقصد سرد جنگ کے معاہدوں کے خرابہ کی جگہ لینا ہے وہ اپنے لئے ایک نیا مقام حاصل کرنے کے لئے بات چیت کرے۔ اس سال اپریل میں جب وزیر اعظم بے نظیر بھٹو جرمنی پہونچیں تو انہوں نے براعظم ایشیا میں پاکستان کی "مرکزی" حیثیت پر زور دیا۔ جرمن Bundestag کی خارجہ امور کی کمیٹی سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "پاکستان نہ صرف جنوبی ایشیا کا ایک ملک ہے بلکہ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے اور اپنے مغرب میں مسلمان ممالک کے ساتھ قریبی تاریخی اور ثقافی تعلقات کی وجہ سے بھی وسط ایشیا اور مشرق وسطیٰ دونوں کے ساتھ اپنے تعلق میں ایک مقتدر مقام رکھتا ہے۔ ہم تنظیم برائے اقتصادی تعاون ECO میں افغانستان، ایران، ترکی اور وسط ایشیا کے ممالک کے ساتھ رابطہ رکھتے ہیں جو اس تنظیم کے رکن ممالک کے درمیان اقتصادی لین دین کو تقویت پہونچانے کے لئے بڑی صلاحیت والا ڈھانچہ فراہم کرتا ہے۔"[۱۳]

تاہم یہ ظاہر ہے کہ جب سے بینظیر کی حکومت برسراقتدار آئی ہے یہ کوشش رہی ہے کہ جوہری توانائی کے مسئلہ اور ہندوستان کے ساتھ تعلقات بالخصوص کشمیر پر کشیدگی کے مسئلہ کے مقابلہ میں وسط ایشیا کے ساتھ تعلقات کے مسئلہ کو اخبارات میں نمایاں حیثیت حاصل ہو گو کہ کبھی اس کوشش میں ناکامی بھی ہوئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں مسائل کے مقابلہ میں وسط ایشیا کے ساتھ تعاون کے لئے پاکستان کے ارادے کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ ایک تقابلی جائزہ کے مطابق پاکستان کی حیثیت مغرب میں اور جنوبی ایشیا میں اتنی مرکزی نہیں ہے جیسی کہ بینظیر دراصل چاہتی ہیں۔ وسط ایشیا کے ساتھ بہت سے معاہدے ہوئے ہیں لیکن ان میں پیش رفت سست رہی ہے۔ ان معاہدوں کے تحت جو منصوبے تیار ہوئے ان سے فائدہ اٹھانے والوں مثلاً تربیت حاصل کرنے والوں یا وفدوں کے اراکین کی تعداد دس سے آگے نہیں بڑھی۔ مقابلتاً" سیرو تفریح کے لئے جانے والوں کی تعداد زیادہ رہی لیکن وہ بھی چند جرات مند مسافروں کی ناجائز کارروائیوں کی وجہ سے کم ہو گئی۔[۱۴] تاجکستان میں بجلی پیدا کرنے کے بڑے منصوبے میں پاکستان کی طرف سے سرمایہ کاری مشکلات کا شکار ہو گئی کیوں کہ پاکستان کے اندر سرمایہ کاری کے تقاضوں کو بیرون سرحد سرمایہ کاری کے تقاضوں پر اولیت دے دی گئی۔[۱۵] جوہری توانائی کا مسئلہ اور ہندوستان کی پریشانی مقابلتاً" کیوں اہمیت حاصل کر گئے وجہ پوری طرح واضح نہیں ہے لیکن اس کا تعلق پاکستان کی سیاست میں اندرونی گروہ بندی سے نظر آتا ہے۔ گذشتہ بہت سالوں سے نواز شریف اور بینظیر کے سیاسی گروہوں میں سیاسی قوت کی تقریباً برابر کی تقسیم

نے سیاسی قوت میں سیمابی کیفیت پیدا کر دی ہے اور سیاستدانوں کو ترغیب دی ہے کہ وہ خاص طور سے ایسے بھڑکیلے مسائل کی تلاش میں رہیں جن کے ذریعہ وہ اپنے حامیوں کی تعداد بڑھا سکیں- نواز شریف نے اپنے دور میں جب کہ مسلم خارجہ پالیسی اور مسلم وسط ایشیا کے ساتھ تعلقات کے استحکام پر زور دیا تو بینظیر وسط ایشیا کے ہندوستان کے ساتھ تعلقات میں حد بندی کے قوم پرستانہ مسئلہ پر زور دے رہی ہیں- تاہم سرد جنگ کے خاتمہ پر دونوں مسئلے وسط ایشیا اور ہندوستان غالباً اس لائق سمجھے گئے کہ ان کے ذریعہ علاقائی معاملات میں پاکستان کو ایک کنارے لگائے جانے کے خوفناک رجحان کے خلاف کوشش کی جائے- "کنارے لگائے جانے کے رجحان" کا اندازہ اس کی اضافی حیثیت میں علاقہ میں قائدانہ کردار ادا کرنے کے عزائم کے تناظر ہی میں کیا جا سکتا ہے - قطعی طور پر پاکستان کو کنارے نہیں لگایا جا سکتا کیوں کہ اس کی اہمیت اس کی اندرونی اور خصوصی طور پر اس کی اقتصادی پالیسی کی کامیابی اور قوت، افرادی قوت اور قدرتی ذرائع پر قائم ہے- بعض مبصرین نے بالخصوص امریکہ میں یہ اندازہ لگایا ہے کہ کشمیر کے مسئلہ پر اس لئے زور دیا جا رہا ہے کہ امریکہ ہندوستان کو کسی قسم کی علاقائی قیادت دلانے سے باز رہے اور جوہری توانائی کے پروگرام کو جاری رکھنے کا جواز بھی مل جائے- اس مسئلہ پر بینظیر کی حکومت نے بیحد جاندار بیانات دیئے ہیں اور حکومت کی طرف سے جوہری توانائی کے مسئلہ کو پاکستان کے تحفظ اور کشمیر کے سلسلہ میں خطرات کے شعور سے مربوط کیا گیا ہے-[۱۶] خطرات اور تحفظ کے مسائل کو فوجی پہلوؤں سے علیحدہ کرنا مشکل ہے- اسی لئے یہ صورت حال پاکستان کے جوہری توانائی کے پروگرام کی مجوزہ پر امن نوعیت سے متصادم ہے- کشمیر کے سلسلہ میں پاکستان کی مہم ہندوستان کو اس مسئلہ پر اپنا رویہ تبدیل کرنے میں کامیاب ہوتی مشکوک نظر آتی ہے- کشمیر میں حالات کے خلاف مقامی مزاحمت کا زیادہ دیر تک جاری رہنا مشکل نظر آتا ہے- ہندوستانی پنجاب میں حالات کا نشوونما ہندوستانی نظام سیاست کی لازوال لچک کی غمازی کرتا ہے- یہ بات سب کو یاد ہے کہ دہشت گردی اپنی معراج کو پہنچنے کے باوجود پنجاب اچانک اپنے معاشی مشاغل کی طرف متوجہ ہوا اور خوشحالی کے دور میں داخل ہو کر غیر معمولی مقدار میں فصلیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوا- اسی لئے پنجاب کی موجودہ حیثیت کو بنیادی طور سے تبدیل کرنے کا کوئی بھی امکان نظر نہیں آتا اور اس مسئلہ کا حل بظاہر اسی موجودہ صورت حال سے نکلے گا- موجودہ گروہ بندی کے ہوتے ہوئے جو ہندوستان اور پاکستان کی سیاست کو گھیرے ہوئے ہے یہ یقینی نظر نہیں آتا کہ دونوں حکومتیں اندرونی اعتبار سے اتنی مضبوط ہوں گی کہ وہ اپنے حامیوں

کے سیاسی حلقے کو مطمئن کرنے کے لئے مسائل کا ایک حل یا کوئی بھی حل دے سکیں۔

لیکن پاکستان کی توقعات پوری ہونے میں سب سے بڑی عملی رکاوٹ افغانستان کا مسئلہ ہے۔ اب تک مصالحت کی تمام کوششیں ناکام ہو گئی ہیں۔ موجودہ تصادم کا غالباً اسلام اور نظریاتی اختلافات سے کوئی تعلق نہیں۔ پاکستان گفت و شنید کے بہت سے مرحلوں میں شامل ہوا ہے جن کا مقصد مصالحت تھا لہٰذا اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا فریقین میں واقعی مصالحت ہو سکتی ہے۔ اس بارے میں کہ پاکستان اب بھی مصالحت کے لئے کیا کر سکتا ہے رائیں مختلف ہیں۔ اگر ربانی کے متعلق شبہ ہے کہ اسے ہندوستان کی حمایت حاصل ہے تو حکمت یار کو بھی ان ذرائع تک رسائی حاصل ہے جہاں سے اسے امداد ملتی ہے ورنہ وہ محض اپنے بل بوتے پر اتنے عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا۔ ایک سوچ یہ بھی ہے کہ پاکستان سے ملنے والی امداد کے کچھ ذرائع اب بھی موجود ہیں۔[۱۷] ظاہر ہے کہ آخری حربہ ابھی تک استعمال نہیں کیا گیا جس کی رو سے دونوں کی امداد کے ذرائع موثر طریقہ سے کاٹ دیئے جائیں یہاں تک کہ وہ دونوں ایک انتخابی اور مشارکتی حل پر مصالحت کر لیں۔ جب تک افغانستان کے حالات معمول پر نہیں آتے اور امن قائم ہونے کی کوئی شکل رونما نہیں ہوتی وسط ایشیا کے ساتھ کسی قسم کا اقتصادی تعاون نہ کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ پسندیدہ۔ حالانکہ جنوبی افغانستان کے ذریعہ کشکا Kushka تک جو بڑی حد تک پر امن خیال کیا جاتا ہے[۱۸] ریل کی پٹڑی بچھانے کے کام کو شروع کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں لیکن یہ مشکل نظر آتا ہے کہ بغیر افغانستان کے مخمصہ کو حل کئے ہوئے صحیح قسم کی اقتصادی نقل و حرکت شروع کی جا سکے۔

ہندوستان کی طرف سے خطرہ

وسط ایشیا میں ہندوستان کی طرف سے چیلنج روز بروز زیادہ "شدید" ہوتا جا رہا ہے۔ وسط ایشیا میں ایک مسلم بلاک کے قیام کے امکانات کی اشاعت جو امریکہ اور پاکستان میں ہوئی اس نے ہندوستان کو خوش فہمی کی نیند سے بیدار کر دیا ہے اور وہ تعاون کی سرفرازی حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ میں لگ گیا ہے۔ (جو محض ایک خیال ہے کیوں کہ دراصل ہندوستان تو ۱۹۵۰ء کی دہائی کے درمیانی حصہ سے وسط ایشیا کے ساتھ تعاون کر رہا ہے۔) اب ہندوستان اس تگ و دو میں مصروف ہے کہ وہ وسط ایشیا کے ساتھ کس قسم کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ پاکستان کی طرح ہندوستان بھی ایران سے گیس درآمد کرنے کے لئے بات

چیت کر رہا ہے۔[۱۹] کہا جاتا ہے کہ وسط ایشیا تک ریلوے کی تعمیر کے لئے وہ ایران کی امداد کرنے کے لئے رضا مند ہے اور یہ ریلوے کی پٹڑی پاکستان کے علاقہ سے نہیں گذرے گی۔ جہاں تک افغان مسئلہ کا تعلق ہے[۲۰] ہندوستان کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ وہ صدر ربانی کی فوجی امداد کر رہا ہے۔[۲۱] ۱۹۹۳ء میں افغانستان کی سردیوں کی امداد کے لئے ہندوستان اقوام متحدہ کے پروگرام کے تحت ۵۹۰۸ ڈالر کی امداد کرنے والے اولین مددگار ملکوں میں شامل تھا۔[۲۲] افغانستان کی امداد کے سلسلہ میں ہندوستان کا منصوبہ پاکستان کے علاقہ سے بالکل باہر ہے۔ ہندوستان کا خیال ہے کہ وہ پاکستان کا چکر لگاتے ہوئے پاکستان کے علاقہ سے بچ کر وسط ایشیا پہنچ سکتا ہے۔ وسط ایشیا میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کسی ایشیائی ملک میں منڈی کی جدید معاشیات نافذ کرنے کی ایک اچھی مثال ہے۔ تقریباً ہزار سال پرانے رشتوں اور مشترکہ روایات کی یاد تازہ کی جا رہی ہے اور اس سلسلہ میں اسلام کا حوالہ دیئے بغیر البیرونی کا ذکر بھی کیا جا رہا ہے۔[۲۳]

کیا ہندوستان کی طرف سے چیلنج خود بخود ایک خطرہ میں بدل گیا ہے؟ ایک تاثر یہ ہے کہ باہمی کشیدگی کے بڑھ جانے سے ہندوستان کے لئے جواز پیدا ہوا کہ وہ وسط ایشیا میں اپنے قدم جمانے کی کوششوں کو تیز تر کر دے۔ پاکستان کے لئے سب سے بدنما منظر یہ ہو گا کہ ہندوستان ایک ایسے علاقہ میں جسے پاکستان کے اکابرین اپنا ہی علاقہ سمجھتے ہیں پاکستان کو پیچھے چھوڑ جائے۔ اندیشہ یہ ہے کہ اس سے پاکستان کے لئے دو محاذ کھل جائیں گے جہاں اسے وسط ایشیا پر اور کسی حد تک افغانستان میں اس کے غلبہ اور اس کے چھا جانے والے اثر کا مقابلہ کرنا ہو گا۔

تاہم کیا یہ امکانی خطرہ واقعی ہے؟ ہندوستان سوائے تاجکستان کے جہاں پاکستان کو ایک مضبوط مقام حاصل ہے وسط ایشیا سے تجارت میں پاکستان سے تین گنا زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہے[۲۴] لیکن یہ حصہ دونوں میں ہر ایک کے لئے ایک فیصد سے بھی کم ہو گا۔ وسط ایشیا میں ہندوستان کی حیثیت کا تقابلی جائزہ ان اعداد و شمار سے بھی واضح ہو جاتا ہے جو ازبکستان کے صدر کریموف نے اپنے ہندوستان کے دورہ کے دوران میں دیئے تھے۔ تقریباً ایک ہزار مشترکہ منصوبوں میں سے جو بیرونی کمپنیوں کے ساتھ ازبکستان میں تیار کئے گئے ہیں ہندوستانی شرکاء ۱۴ میں شامل ہیں جن میں سے چھ منصوبوں پر حقیقتاً عملدرآمد شروع ہو گیا ہے۔[۲۵] پاکستان کے ساتھ ایسے منصوبے تعداد میں اس سے بھی کم ہو سکتے ہیں لیکن ہندوستان کو وسط ایشیا میں غالب یا بااثر کہے جانے کے لئے بھی ابھی بہت کچھ کرنا ہو گا۔

وسط ایشیا میں پاکستان اور ہندوستان دونوں کے علاوہ دوسرے بین الاقوامی شرکاء ہیں جو تعاون حاصل کرنے کی کوششوں میں بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ یہ مضمون کیوں کہ صرف ان مسائل کا جائزہ لے رہا ہے جو پاکستان کو درپیش ہیں یہ محض تذکرتاً کہا جاتا ہے کہ چین ان میں سب سے آگے ہے جو کہ قاز قستان کی تجارت کے ۳۰ فیصد زائد حصہ سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ترکی بھی ایک مضبوط حیثیت رکھتا ہے۔[۲۶] حالانکہ وسط ایشیا کی ترک ریاستوں کے ساتھ اس کا رویہ کچھ ترجیحی ہے۔ ایران کا تعلق آذربائیجان اور تاجکستان سے زیادہ ہے۔[۲۷] یوروپین برادری بھی خاصی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے اور اس نے ان تمام ریاستوں سے تعاون کے معاہدے کر لئے ہیں۔ نئی صنعتکار قومیں مثلاً جنوبی کوریا' تائیوان اور اسرائیل مضبوطی اور مستعدی کے ساتھ مختلف طریقوں سے وسط ایشیا کی منڈیوں میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مثلاً کوریا کی ایک اقلیت انہیں ریاستوں میں سے ایک ریاست میں آباد ہے۔ یہ ایک اعلیٰ درجہ کا مقابلہ ہے جس میں پاکستان کے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک نہیں کیا جائے گا۔

وسط ایشیا کے تناظر میں ہندوستان کی طرف سے خطرہ حقیقت کے مقابلہ میں خیالی زیادہ ہے۔ پاکستان اور ہندوستان ابھی تک ایک ایسے کھیل میں مصروف ہیں جس کی کوئی حیثیت نہیں جس کا تعلق سرد جنگ کے دور سے ہے جہاں ایک فریق کا نفع دوسرے فریق کا نقصان شمار ہوتا تھا۔ جیسا کہ تاریخ نے اپنے وسیع تناظر میں ثابت کیا ہے کہ یہ صورت حال ایسی ہے کہ اس میں امکانی طور پر کوئی بھی کامیاب نہیں ہے۔ وسط ایشیا کے تناظر میں جہاں تک تعاون کا تعلق ہے تعاون کی قیمت بہت زیادہ ہے اور نفع کچھ بھی نہیں۔ شاید یہی صورت حال اس منصوبہ کی صحیح قدر و قیمت کی ہے اس لئے کہ وسط ایشیا کے لیڈروں میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اس مسابقت کی دوڑ کو اپنے نفع کے لئے استعمال کرنے کا رجحان پیدا ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف کشمیر کے مسئلہ کے حل سے جوہری توانائی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور علاقہ کے لئے مالی اور اقتصادی ذرائع کی درآمد میں رکاوٹیں بھی دور ہو جائیں گی۔ اسی صورت میں وسط ایشیا کے لئے سوچے ہوئے بڑے منصوبے مثلاً ریلوے لائن' قدرتی گیس کی پائپ لائن' سڑکیں وغیرہ کامیابی کے ساتھ قابل عمل ہو سکیں گے۔ موجودہ صورت حال میں بین الاقوامی سرمایہ کار بظاہر کئی مرتبہ سوچیں گے کہ آیا ایسے طویل المعیاد منصوبوں کی بنیادی ڈھانچوں پر سرمایہ کاری جائے جہاں کشیدگی اور جوہری توانائی کے بادل ہر وقت سروں پر چھائے ہوئے ہیں۔ اس علاقائی صورت حال کا تضاد یہ ہے کہ پاکستان کی وسط ایشیا تک پہنچ کا انحصار

جہاں سے اسے ہندوستان کے مقابلہ میں حمایت کی توقع ہے اس بات پر ہے کہ وہ پہلے ہندوستان کے ساتھ اپنے اختلافات دور کرے۔

عبوری دور

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے کہ اس علاقہ کی پالیسی کے مقاصد کو واضح کرنے اور ان پر عملدر آمد کرانے میں اتنا بعد ہے اس کی کچھ وجہ تو عبوری مسائل ہو سکتے ہیں جن کا مقابلہ اس علاقہ کے ہر ملک کو کسی نہ کسی صورت میں کرنا پڑے گا۔

وسط ایشیا کی ریاستوں کو منڈی کی معیشت تک پہنچنے کے لئے راستہ بنانا ہے۔ موجودہ قیادت کی دلچسپی اس عمل میں اس حد تک ہے کہ وہ ان کے اقتدار کو مستحکم رکھے۔

افغانستان بلا شبہ ایک شدید ہنگامہ کا شکار ہے اور یہ شورش خانہ جنگی کی خندقوں اور معاشی ترقی اور معاشرتی اداروں کے میدانوں اور پہاڑوں کے درمیان یقیناً ایک عبوری دور ہے۔ ۱۹۹۳ء کے گذشتہ انتخابات سے پہلے رونما ہونے والے واقعات نے ثابت کیا ہے کہ پاکستان خود ایک ایسے عبوری دور سے گذر رہا ہے جو تاریخی اعتبار سے بیحد اہم ہے اور جو سیاستدانوں کے سیاسی مقاصد کی افسردگی اور ہراس کا سبب ہے۔ قائم مقام وزیراعظم معین قریشی نے ایک نئے معاشرہ کے لئے لائحہ عمل تیار کیا تھا جس کے ذریعہ ایک عام آدمی کو تمام آسانیاں اور سہولتیں ایک بہتر انداز میں حاصل ہوں گی۔[۲۸] صاف و شفاف سیاسی نظام، معیشت کی مستعدی، مملکت کے معاشی کردار کی مزید وضاحت اور پاکستان کے بنیادی معاشی اور سیاسی اداروں کی تعمیر نو یہ وہ مسائل تھے جو تمام بڑی سیاسی پارٹیوں اور مذہبی پارٹیوں کے انتخابی منشور میں شامل تھے۔ اس تناظر میں "اسلامی فلاحی مملکت" کا قیام ایک اہم سیاسی نعرہ بن گیا تھا۔ ہندوستان بھی اسی قسم کی مشق میں مصروف ہے۔ اس کے معاشی اصلاح کے پروگرام نے ایک ایسے معاشرے کو منظر عام پر لانا شروع کیا ہے جس میں اس کے جمہوری پہلو اور دیگر تمام خوبیوں کے باوجود بہت سے رکاوٹیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہی پاکستان کے لئے حقیقی اور حکمت عملی کے ساتھ حل ہونے والا چیلنج ہے کہ وہ وسط ایشیا سے متعلق اپنی پسندیدہ سوچ پر عمل پیرا ہونا چاہتا ہے یا دوسرے سیاسی مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ہندوستانی منڈی اور اس کی معیشت کا محض حجم آزاد معاشرہ کے رجحان کے بتدریج نفاذ کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی قوتوں پر غیر معمولی اثر ڈالے

گا اور اس کے پڑوسی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ تیز رفتار ترقی میں چین کی مثال موازنہ کے لئے پیش کی جا سکتی ہے۔ چین اب ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے کہ وہ خود اپنے سیاسی اور بین الاقوامی منشور کے ساتھ آگے بڑھ سکتا ہے کیوں کہ اس کی معاشی قوت اور دلکشی نے موثر طور پر امریکہ اور دوسری جگہوں پر مخالف آوازوں کو دبا دیا ہے۔ تاہم یہ پیشین گوئی کرنا مشکل ہے کہ ہندوستانی منصوبہ بھی اسی طرح کامیاب ہو جائے گا اور اس کے لئے آخر کار وہ کیا طریقہ اختیار کرے گا۔ عبوری پہلو سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ معاشی ترقی اور سیاسی استحکام کے میدان میں نہ کہ فوجی میدان میں مستقبل کے تحفظ کی راہیں طے کی جائیں گی۔ علاقائی تعاون کے تمام شرکاء اسی صورت حال سے دوچار ہیں۔

اختتامیہ

وسط ایشیا کے مسئلہ میں دلچسپی رکھنے والے فریقوں کے رجحانات میں بے حد اختلاف پایا جاتا ہے۔ مطلوبہ نتائج اسی صورت میں برآمد ہوں گے جب کہ ان فریقوں کے درمیان اتفاق رائے کے لئے وسیع میدان موجود ہو گا۔ اگر وہ واقعی چاہتے ہیں کہ وسط ایشیا کے اختیاری موقف پر عمل ہو تو یہی وقت ہے کہ وہ تمام اختیاری موقف اور مقاصد کا جائزہ لیں اور صحیح طریقہ سے ترجیحات کا تعین کریں اور ماضی کے فرسودہ خیالات سے چھٹکارہ حاصل کریں۔

تاہم رجحانات اور نظریات ہم ہوتے ہیں یہ صحیح ہے کہ ان کی صحت کو ہمیشہ چیلنج کیا جانا چاہئے اور ان کے صحیح معانی اور مطالب کو دریافت کرنا چاہئے لیکن رجحانات اور حقائق کی عدم مطابقت کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ یہی میدان ہے جہاں لوگ حالات کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں جو متواتر اور تیزی سے بدل رہے ہیں۔ رجحانات مقاصد کا تعین کرتے ہیں اور لائحہ عمل کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ بات اہم ہے کہ رجحانات میں لچک رہنی چاہئے۔ اس لچک کے ذریعے اگر حقیقت تک پہنچنے میں کوئی خلیج آتی ہے تو وہ خطرناک حد تک نہیں جائے گی۔ اسے تشدد کے ہتھیاروں سے قابو کرنے کی بجائے اس پر سیاسی عمل کے ذریعہ قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے وسط ایشیا کا مسئلہ انوکھا نہیں ہے بلکہ ایک بہت عام سا عالمگیر مسئلہ ہے۔

پھر بھی سوچ کا یہ طریقہ بالکل منفی نہیں ہے۔ اگر وسط ایشیا کے ساتھ تعاون حاصل کرنے کے لئے

کوشش عملی اقدام اور حقیقت پسندانہ انداز سے کی جائے تو پاکستان کامیابی حاصل کر سکتا ہے- جب تک تجارتی مال وہاں نہیں پہنچایا جا سکتا پاکستان انہیں سہولتیں فراہم کر سکتا ہے- مثلاً بنک، انشورنس یا ذرائع ابلاغ کارگذاری کے بڑے مواقع فراہم کرتے ہیں- وسط ایشیا کے ساتھ تجارت اور کاروبار میں رہنمائی کے لئے مواد پاکستان میں زیر طبع ہے- علاقائی تعاون میں شک و شبہ کی گنجائش ہوا کرتی ہے کیوں کہ کسی علاقہ کی امداد کے لئے جو تناؤ - تنازعہ اور شک سے گھرا ہوا ہو یہ سب سے زیادہ کارآمد طریقہ ہے- اگر یہ کامیاب ہو جاتا ہے تو فائدہ بے تحاشا ہو گا-

حوالہ جات

1. For the purpose of the general political argument Azerbaijan is subsumed under the Muslim Central Asian Republics, though it does not belong to Central Asia.

   The author works with the Center for Modern Oriental Studies, Berlin, a programme for research projects from the former East German Academy of Sciences, now associated with the German Max-Planck-Society. He has contributed several articles on politics and history of South Asia to international research journals, particularly on political Islam.

2. Maqbool A. Bhatty, "Pakistan's Perspective on Central Asia," in *Strategic Studies*, Vol. XVI, Spring 1994, No.3, pp.23-24.

3. A.K. Sultangalyeva, "Islam v Kazakhstan," (Islam in Kazakhstan) in *Vostok*, Moskva, No.3, 1994, pp.77-78, from a paper originally delivered at a conference on Central Asia at the University of Wisconsin, USA.

4. The Russian argument in this paper is debated at length in order to introduce material that is otherwise little used in this context.

5. Bess Brown, 'Central Asia: The Economic Crisis Deepens,' in *Radio Free Europe Radio Liberty Research Report*, Vol.3, No. 1, 7 January 1994, pp.59-69.

6. Andranik Migranyan "Sny ob SNG," (Dreams about the CIS in *Literaturnaya Gazeta,* Moscow, 14 Sep. 1994, p.11.

7. Cf. Round-table discussion by Russian academics on The new geopolitical situation in Central Asia and its consequences for Russia, (Russian) in *Vostok*, No.6 1993, pp.63-131. The same argument is used in Migranyan's article, "Dreams about the CIS," *op.cit.*

8. Umerserik Kasenov, "Razmyshlenya o evraziyskom soyuze," (discussing a Eurasian Union), in *Nezavisimaya Gazeta,* Moscow, 16.10.94. The author is director of the Kazakh Institute of Strategic Studies attached to the President's office.

9. Vyatcheslav Ovlev, "Novaya geopoliticicheskaya real "nost", (New geopolitical fact) in *Nezavisimaya Gazeta,* Moscow, 12.10.94.

10. For Huntinton's concept, see Samual P. Huntington, "The Clash of Civilizations?" in *Foreign Affairs,* Vol 72, No.3, Summer 1993, pp.21-49; for a critical evaluation of his thesis from the American perspective, see Richard E. Rubenstein, Jarle Crocker, "Challenging Huntington," *Foreign Policy,* No.96, Fall 1994, pp.113-128.

11. *Dawn*, Karachi, 30.1.94.

12. Cf. Kasenov's article, discussing the Eurasian Union where he also discussed the civilisation argument, *op.cit.,* and interview with Shameem Akhtar, "The Clash of Civilizations thesis is untenable, in *The News,* Islamabad, 1.11.1994, p.11.

13. *Dawn*, Karachi, 21.4.94.

14. 'Visa curb on non-Muslim visitors from ex-USSR,' in *Dawn*, 9.5.94.

15. Cf. Foreign Minister Assef Ahmad Ali during his tour of Uzbekistan, Kazakhstan and Kyrgyzstan in January 1994, in *Dawn*, 8.1.94; see also press release on the visit of the Tajik President, Emomali Rakhmanov to Islamabad in March 1994, in *Dawn*, 31.3.94.

16. For a recent exposition of this approach, see Benazir Bhutto's interview to the *Herald*, Karachi, October 1994, pp.42-46: The US-Pakistan relationship "got caught up in a groove where we were only talking on the nuclear issue....But we cannot do what is required by American law because it is not acceptable to our own security perceptions arising from the Kashmiri dispute, arising from the three wars with India." (p.43).

17. The Afghan Ambassador in Paris told the BBC on 16 July 1994 that "the military circles in Pakistan, and specifically ISI, is actively involved" in supplying arms to the Hekmatyar group. *Asian Recorder,* Delhi, Vol. XXXX, No.32, p.24143.

18. Cf. *Tehran Times,* 3.8.94.

19. 'India keen on gas pipeline from Iran,' *Tehran Times,* 12.7.93; also ibid., 9.10.93.

20. 'India to take part in construction of Iran-Central Asia railroad,' *Tehran Times,* 11.11.93.

21. President Rabbani's administration expressed concern over Pakistani newspaper reports on Indian military assistance through a press release of his embassy in Islamabad on 17 July 1994. Cf. *Asian Recorder,* Delhi, Vol.XXXX, No.32, p.24143.

22. *Dawn*, 30.11.93.

23. Cf. the visit of Uzbek President Karimov to India in January 1994 and its coverage in the *Pravda Vostoka,* Tashkent, 3-5 Jan. 1994.

24. Cf. table 2 'Asiatische Handelspartner Zentralasiens 1993' (Asian trading partners of Central Asia in 1993), in Klaus Fritsche, *Indians Rolle in Zentralasien. Schlechte Karten im 'GroBen Spiel'?* (Aktuelle Analysen, 51/1994) Köln: Bundesinstitut für ostwissenschaftliche und internationale Studien, 1994, p.5.

25. *Pravda Vostoka,* 7-1-1994.

26. A major recent activity was the summit of Turkic states in Istanbul on 18-19 October 1994. Cf. *The News,* 20-22 October, 1994.

27. See Qureshi's address to the nation on radio and television, in *Dawn*, 20-8-93.